# اسوۂ دعوت

خرم مرادؒ

نبی کریمؐ کا ہر نقش' ہر قدم' ہر ادا' ہر بات' ہر عمل ہمارے لیے بہترین اسوہ' قابلِ عمل نمونہ اور مثال کی حیثیت رکھتا ہے۔ قرآن مجید نے خود اس بات کو بیان فرمایا ہے کہ تمھارے لیے اللہ کے رسول کی ذات میں بہترین اسوہ ہے۔ لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ (الاحزاب ۳۳:۲۱)۔ یہ اس لیے بھی ہے کہ اللہ کا رسول آتا ہی اس لیے ہے کہ اس کی پیروی و اطاعت کی جائے۔ یہ اطاعت و پیروی ہی وہ واحد چیز ہے جس میں اللہ کے رسول کی اطاعت، اللہ کی اطاعت کے برابر ہے۔ جس نے رسول کی اطاعت کی' دراصل اس نے خدا کی اطاعت کی۔ مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ ج (النسآء ۴:۸۰)

رسول کی اتباع اور پیروی محض اللہ کی اطاعت ہی نہیں بلکہ اللہ کی محبت کی نشانی بھی ہے:

قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ وَیَغْفِرْلَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ ط (اٰل عمرٰن ۳:۳۱) اے نبیؐ، لوگوں سے کہہ دو کہ "اگر تم حقیقت میں اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی اختیار کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمھاری خطاؤں سے درگزر فرمائے گا۔"

یہ اس وجہ سے نہیں ہے کہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں' بلکہ اس لیے کہ آپؐ کا اسوہ کامل ترین اسوہ ہے۔ وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ ○ (القلم ۶۸:۴) "اور بے شک تم اخلاق کے بڑے مرتبے پر ہو"۔ گویا آپؐ کا کردار اور آپؐ کی سیرت انسانوں کے لیے ہر لحاظ اور ہر پہلو سے

بہترین اور کامل نمونہ ہے۔

رسالت اور اسوۂ کامل، یہ دونوں باتیں لازم وملزوم ہیں۔ اس لیے کہ جو اللہ کا رسول ہوگا وہ لازماً اسوۂ کامل کا حامل بھی ہوگا' اور جو اسوۂ کامل کا حامل ہوگا اسی کو اللہ تعالیٰ اپنی رسالت کے لیے منتخب فرمائے گا۔ تاہم اس کا ایک اور پہلو بھی ہے وہ یہ کہ اللہ کے رسولؐ کی زندگی کے بہت سارے پہلو ہیں۔ آپؐ سربراہ ریاست بھی تھے اور قانون ساز بھی' باپ بھی تھے اور شوہر بھی، دوست اور ساتھی بھی تھے اور فوج کے سپہ سالار بھی' نیز معلم ومربی بھی' اور یہ ساری حیثیتیں آپؐ کی رسالت کی حیثیت کے تابع تھیں۔ لیکن رسالت کا بنیادی فریضہ یہ تھا کہ اللہ کی بندگی کا پیغام انسانوں تک پہنچایا جائے۔ اس لحاظ سے قرآن مجید نے جب یہ کہا کہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں تو جہاں یہ بات واضح ہوگئی کہ اللہ کے رسولؐ ہونے کی حیثیت سے آپؐ کا اسوہ قابل اتباع ہے، وہاں یہ بات بھی عیاں ہوگئی کہ اللہ کے رسول ہونے کی حیثیت سے رسالت کا فریضہ ادا کرنے میں اور کارِ رسالت انجام دینے میں بھی آپؐ کا طریقہ، آپؐ کی روش اور آپؐ کا اسوہ ہی ہمارے لیے بہترین نمونہ ہے۔

## کارِ رسالت، ایک اہم پہلو

کارِرسالت کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیا کو شاہد، مبشر، نذیر اور داعی الی اللّٰہ بنا کر بھیجا۔ اس حوالے سے انبیا کی جس صفت پر بھی غور کیا جائے، اس کا حاصل یہی ہے کہ اللہ کے بندوں تک اللہ کی ہدایت اور اس کا پیغام پہنچے۔ رسول کے لفظ کے اندر یہ حقیقت پوشیدہ ہے کہ وہ پیغامبر ہوتا ہے اور جو پیغام لے کر آتا ہے اسے دوسروں تک پہنچاتا ہے۔ یہ ایک ایسی ذمہ داری ہے کہ اللہ کے رسول کوئی اور کام کر پائیں یا نہ پائیں لیکن اُن سے اِن کی اس بنیادی ذمہ داری کے بارے میں لازماً سوال کیا جائے گا کہ تم نے اس کو کہاں تک ادا کیا۔ لوگ مانتے ہیں یا نہیں مانتے' پیچھے چلتے ہیں یا نہیں چلتے' پکار پر لبیک کہتے ہیں یا نہیں کہتے' اور اللہ کے رسول اس میں کامیاب ہوتے ہیں یا نہیں ہوتے کہ اللہ کے دین کو سارے دینوں پر غالب کردیں' لیکن یہ فریضہ ایسا ہے جو بنیادی طور پہ لازماً ان کے ذمے کیا گیا ہے۔

یٰٓاَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ (المائدہ ۵:۶۷) اے پیغمبر، جو کچھ تمھارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے وہ لوگوں تک پہنچا دو۔

گویا اگر رسول نے پہنچانے کا کام سرانجام نہیں دیا تو فی الواقع اللہ نے جو پیغام دیا ہے، اس کے پہنچانے کا حق ادا نہیں ہوا۔ یوں سمجھ لیں کہ رسالت کے سارے فرائض کا انحصار مخاطبین کے اُوپر ہے۔ وہ مانیں گے تو مومن وجود میں آئیں گے۔ وہ ساتھ دیں گے تو ساتھ چلنے والے ملیں گے لیکن ایسا بھی ہوسکتا ہے ۹۰۰ برس رات دن پکارنے کے بعد بھی تھوڑے ہی لوگ ہوں جو ساتھ دینے کے لیے تیار ہوں۔ وَمَآ اٰمَنَ مَعَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلٌ ○ (ھود ۱۱:۴۰) ''اور تھوڑے ہی لوگ تھے جو نوحؑ کے ساتھ ایمان لائے تھے''۔ اگر دعوت کے نتیجے میں تھوڑے لوگ ایمان لائیں یا لوگ دعوت رد کردیں تو اس پر رسول سے کوئی پرسش نہیں ہے۔ وہ اس کے لیے جواب دہ نہیں ہے۔ البتہ جس بات میں اس کی جواب دہی ہے وہ یہ ہے کہ اس نے دعوت پہنچانے کا کام اور لوگوں کو خدا کی طرف پکارنے کا کام کہاں تک انجام دیا۔ اگر اس نے اس کام کو مکمل کر دیا تو رسالت کا سب سے بنیادی فریضہ اور اس کی بنیادی ذمہ داری ادا ہوگئی۔

یہ جاننا ہمارے لیے اس لیے بھی ضروری ہے کہ اکثر دعوت دین اور اقامت دین کا کام کرتے ہوئے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ وہ کام کرنا بھی ہماری ذمہ داری ہے جو دوسروں کے ماننے اور دوسروں کا ساتھ دینے اور اللہ کی خشیت اور حکمت پر منحصر ہے۔ جب وہ کام پورا نہیں ہوتا تو ہم مایوسی کا شکار ہوکر اس کام کو بھی چھوڑ دیتے ہیں جس کام سے کوئی مفر نہیں اور جس ذمہ داری کو بھی ٹالا نہیں جاسکتا۔ وہ یہ کہ اللہ کے ایک ایک بندے تک اس کی ہدایت، اس کی زندگی کا پیغام، اللہ پر ایمان لانے کی دعوت، اس کی اطاعت کا مطالبہ اس کے سامنے پیش کیا جائے۔ یہی دراصل کارِ رسالت کا ماحاصل ہے۔ آج بھی جو اسلامی تحریک کا نام لیتا ہے، اقامتِ دین کا دعوے دار ہے، وہ کوئی اور کام کر پائے یا نہ کر پائے لیکن اس کام کے لیے اس کی ذمہ داری اور اس کی جواب دہی ایسی ہے جس سے وہ چھوٹ نہیں سکتا جب تک کہ وہ اس کام کو کماحقہ، انجام نہ دے۔

اسوۂ رسالت کے تحت میں مختصراً دو چیزوں کا ذکر کروں گا اور یہ دونوں چیزیں بالکل لازمی اور ناگزیر ہیں۔ دعوت کے ضمن میں اُن طریقوں کو صحیح طور پر استعمال کرنے کے لیے جو طریقے

نبی کریمؐ نے اختیار کیے ہیں ایک خاص جذبہ، کیفیت اور روح درکار ہے۔ اس لیے کہ دعوت کا کام کوئی مجرد فنی مہارت کا کام نہیں ہے اور اس کو عام اصولوں کی طرح نہیں سیکھا جاسکتا۔ اس کام کے طریقے، اس کام کے راستے اسی وقت سیکھے جاسکتے ہیں اور ان پر عمل درآمد اسی وقت ہوسکتا ہے جب ان کی پشت پر وہ کیفیت، وہ روح اور وہ جذبہ کارفرما ہو جو دعوت الی اللہ کے لیے ضروری ہے، اور جس کی نمایاں مثال نبی کریمؐ کی اپنی زندگی اور اپنا اسوۂ دعوت ہے۔

## دعوت اور احساسِ ذمہ داری

پہلی بات یہ ہے کہ دعوت کی ذمہ داری ایک بڑی بھاری ذمہ داری ہے جس کے احساس سے آپؐ کا دل گراں بار تھا، جس کے بوجھ سے آپؐ کو اپنی کمر ٹوٹتی ہوئی محسوس ہوتی تھی، جس کو اللہ تعالیٰ نے خود قولِ ثقیل (بھاری بات) سے تعبیر کیا ہے۔ یہ اس لیے تھا کہ یہ ذمہ داری کس کی طرف سے تھی، نیابت کس کی ہو رہی تھی، بات کس کی تھی جو دوسروں تک پہنچانا تھی اور جواب دہی کس کے سامنے تھی ___ یہ اللہ کی طرف سے تفویض کردہ ذمہ داری تھی اور اس کی جواب دہی خود اپنے سامنے اور ربِ کائنات کے سامنے تھی۔ یہ ذمہ داری نہ کسی اجتماع میں رپورٹ تک محدود تھی، نہ صرف دنیا کے اندر کچھ کامیابی حاصل کرنے کے لیے تھی، بلکہ اللہ کے رسول اس منصب پر اپنے رب کی طرف سے فائز کیے گئے تھے اور رب کا دیا ہو کام ایسا تھا جو ہر حال میں، ہر طرح انجام دینا تھا۔

مجرد یہ احساس اور شعور کہ یہ میرے رب کا کام ہے، میں نے رب کے بندوں کو حق کی طرف بلانا ہے، ان کو غلط راستوں پر بھٹکنے سے بچا کر صحیح راستے پر لگانا ہے، یہ اپنی جگہ اتنی زبردست ذمہ داری تھی کہ اقرأ کا پیغام سننے کے بعد ہی حضورؐ کانپتے، لرزتے اپنے گھر واپس آئے اور اپنی اہلیہ محترمہ سے کہا کہ زمّلونی، مجھے اڑھادو، مجھے اڑھادو۔ مجھے اپنے نفس کے بارے میں ڈر ہے۔ اتنا عظیم الشان کام اقرأ (پڑھنے اور سنانے) کا کام، رب کے نام سے دنیا کو پکارنے کا کام، اور دنیا کو یہ پیغام دینا کہ علم کا سرچشمہ صرف اللہ کی ذات ہے، اس سے ماورا بے نیاز ہوکر، جو علم کا دعوے دار ہے، وہ قطعی غلط ہے، نیز اللہ کی ذات سے اور اللہ کی ہدایت سے پوری انسانی زندگی کا رشتہ جوڑنا، یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ۝ (العلق ۹۶:۱)،

میں یہ پوری ذمہ داری پوشیدہ تھی اور حضورؐ اسی لیے کانپتے اور لرزتے ہوئے واپس آئے تھے اور یہ فرمایا تھا کہ مجھے اپنے نفس کے بارے میں ڈر اور خوف محسوس ہوتا ہے۔ یہ اس مقامِ دعوت کی عظمت اور اس کی گراں باری تھی جس نے قلبِ مبارک پر اس کیفیت کو طاری کر دیا تھا۔

اس کے ساتھ ساتھ جو چیز تھی وہ صرف یہ نہیں تھی کہ دنیا کے اندر اتنا عظیم الشان کام درپیش ہے بلکہ یہ کہ اس کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔ اگر اس کام کے اندر کوتاہی ہوئی تو جو لوگ گمراہی کے راستے پہ جائیں گے، بھٹک جائیں گے اور غلط راہ پر پڑ جائیں گے، وہ جن کے سامنے حجت پوری نہیں ہوگی، اس کا ذمہ دار وہ بھی ہوگا جس کے پاس پیغامِ حق ہو اور وہ اس کو پہنچانے سے قاصر رہے۔ اسی لیے جب آپؐ اس حوالے سے سوچتے تھے، آپؐ کے سامنے اس کا ذکر ہوتا تھا تو آپؐ لرزہ براندام ہو جاتے تھے، آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے تھے۔

ایک طرف تو جواب دہی کا یہ احساس تھا جس کے بوجھ سے آپؐ کو اپنی کمر ٹوٹتی ہوئی محسوس ہوتی تھی تو دوسری طرف خود وحی کے نزول کا مرحلہ بھی بہت کٹھن تھا۔ اس سے نہ صرف جسم کے اُوپر بوجھ پڑتا تھا بلکہ جب یہ کلام نازل ہوتا تھا تو اس کے بوجھ سے اونٹنی بھی بیٹھ جایا کرتی تھی اور آپؐ کی پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہوا کرتے تھے۔ یہ تمام کیفیات کلامِ حق اور ہدایت الٰہی کو وصول کر کے پہنچانے کی ذمہ داری کا احساس کا نتیجہ تھیں۔

آخرت کی جواب دہی کے حوالے سے اللہ تعالیٰ نے صاف صاف کہا تھا:

فَلَنَسْئَلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْئَلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ (الاعراف ۷:۶)

پس یہ ضرور ہو کر رہنا ہے کہ ہم اُن لوگوں سے باز پرس کریں جن کی طرف ہم نے پیغمبر بھیجے ہیں، اور پیغمبروں سے بھی پوچھیں (کہ انھوں نے پیغام رسانی کا فرض کہاں تک انجام دیا اور انھیں اس کا کیا جواب ملا)۔

یہ سوال صرف انھی سے نہیں ہوگا جو مخاطب تھے کہ تم نے یہ بات کیوں رد کر دی، بلکہ مرسلین جن کو رسول بنا کر بھیجا گیا، ان سے بھی سوال کیا جائے گا کہ تم نے اپنی ذمہ داری کو کہاں تک ادا کیا۔ یہ کتنی بڑی ذمہ داری تھی، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہ ایک ایسا بوجھ تھا جس سے کمر ٹوٹتی محسوس ہوتی اور بدن لرزتا اور کانپتا تھا، اور جواب دہی کا احساس دل و دماغ کے اُوپر چھایا رہتا تھا۔

**داعیانہ تڑپ**

یہ ذمہ داری رب کی طرف سے تھی کہ اللہ کے بندوں کو بھٹکنے سے بچا کر صحیح راستے پر لگایا جائے۔ ذرا تصور کیجیے کہ وہ دل اور وہ قلب جو انسانوں کی محبت سے سرشار ہو' جو ۴۰ سال سے دن رات انسانوں کی خدمت کے اندر لگا ہوا ہو' اس کو جب یہ معلوم ہو کہ یہ وہ پیغام ہے جس سے انسان آگ سے بچ کر اللہ کی جنت کی طرف جا سکتے ہیں تو آپ سوچ سکتے ہیں کہ اس کی کیفیت کیا ہوگی۔ نبی کریمؐ نے اس بات کو یوں بیان فرمایا کہ میری مثال ایسی ہے جیسے کسی نے آگ جلائی، اور جب آگ روشن ہوگئی تو لوگ پروانوں کی طرح آگ میں گرنے لگے اور مجھ کو مغلوب کر کے آگ میں گرنے لگے' اور میں تمھاری کمر پکڑ کر تم کو بچا رہا ہوں اور تم ہو کہ آگ کے اندر گرے جا رہے ہو۔ اگر اپنا بچہ آگ کے قریب چلائے' یا کسی حادثے کا شکار ہو جائے' یا تباہی کے گڑھے پر کھڑا ہو تو قلب کی جو کیفیت ہوگی وہی نبی اور داعی کے قلب کی کیفیت ہوتی ہے اور ہونی چاہیے۔

ایک نبی کی حیثیت اپنی قوم کے لیے باپ کی سی ہوتی ہے۔ وہ کتنی ہی گمراہ کیوں نہ ہو' وہ اس کو نصیحت اور خیرخواہی سے آخر وقت تک بے نیاز نہیں ہوسکتا۔ وہ اس کے اُوپر غصے و ناراضی اور مایوسی کا اظہار نہیں کرتا۔ اگر وہ پتھر بھی کھاتا ہے تو دعا کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو ہدایت دے اور صحیح راستے پر لگائے۔ وہ اپنی ذات کے لیے نہ کچھ اجر مانگتا ہے اور نہ انتقام کا طالب ہوتا ہے۔ اس کی ساری محبت اور دشمنی صرف اللہ کے لیے اور اس کے پیغام کے لیے ہوتی ہے۔ اسی کیفیت کی وجہ سے نبی کریمؐ دن، رات اسی فکر کے اندر گھلا کرتے تھے اور ہر داعیِ حق کو بھی گھلنا چاہیے کہ کس طرح یہ پیغام عام ہو۔ دل کی یہ فکر عمل کے اندر ظاہر ہوتی تھی۔ گھر گھر جانا، گلیوں میں گھومنا' لوگوں کو دعوت دینا' اپنے گھر پر بلانا اور دعوت دینا' پہاڑی پہ چڑھ کے وعظ کہنا' حج کے موقع پر خیموں کے اندر جانا' ہر موقع سے فائدہ اٹھانا' ہر آنے جانے والے سے موقع نکال کر حکمت کے ساتھ اپنی بات کہنا' یہ سب کس طرح ہو، اسی فکر میں آپؐ دن رات گھلا کرتے تھے۔

آپؐ کی اس کیفیت کو قرآن مجید نے مختلف الفاظ میں بیان کیا ہے۔ کہیں فرمایا کہ کیا اس فکر میں تم اپنا گلا گھونٹ ڈالو گے۔ کہیں اس کے لیے حرص کا لفظ استعمال ہوا۔ کہیں فرمایا:

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ

(التوبۃ ۹:۱۲۸) ''دیکھو! تم لوگوں کے پاس ایک رسول آیا ہے جو خود تم ہی میں سے ہے، تمھارا نقصان میں پڑنا اس پر شاق ہے، تمھاری فلاح کا وہ حریص ہے''۔ گویا بھلائی اور دعوت حق کی طرف بلانے کے لیے نبی کی فکر اور آرزو اور تمنا لالچ کی حد تک پہنچی ہوتی ہے۔ جس طرح لالچی آدمی برابر سوچتا رہتا ہے کہ مطلوبہ چیز کو کس طرح حاصل کرے، اس کے پیچھے پڑا رہتا ہے، اپنا سب کچھ اس کے لیے لگاتا ہے، وہی کیفیت نبی کریمؐ کی تھی اور وہی کیفیت ہر داعیِ حق کی بھی ہونی چاہیے۔

اس میں نہ مایوسی کا گزر تھا اور نہ جھنجھلاہٹ کا، اور نہ اپنی قوم سے نفرت اور بے زاری کا بلکہ شفقت و رحمت کے ساتھ مسلسل آپؐ اس کام کے اندر لگے رہے۔ یہاں تک کہ یہ تمنا کہ جو دیکھنے والے نہیں ہیں، کسی طرح ان کو دکھا دیں، جو سننے والے نہیں ہیں کسی طرح ان کو سنا دیں، جو بھٹک رہے ہیں ان کو کسی طرح صحیح راستے پر لگا دیں۔ اس کی تصویر قرآن مجید نے یوں کھینچی کہ تم اندھوں کو راستہ نہیں دکھا سکتے، تم بہروں کو نہیں سنا سکتے، یعنی جو جان بوجھ کر بھٹک گئے ہیں تم ان کو صحیح راستے پہ نہیں لگا سکتے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس ہدایت کے باوجود آپؐ کی یہ کیفیت کہ کسی نہ کسی طرح لوگ ہدایت پا جائیں، بالکل آئینے کی طرح نمایاں ہوکر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔

لوگوں کی ہدایت اور ان کو گمراہی سے بچانے کے لیے آپؐ اس قدر بے قرار تھے کہ اگر لوگ نہیں مانتے تو کوئی ایسی نشانی آجائے جسے دیکھ کر لوگ ایمان لے آئیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ تم آسمان میں سیڑھی لگا کر چڑھ جاؤ، یا زمین کے اندر سرنگ کھود لو، یا اور کوئی نشانی لے آؤ، یہ لوگ اس کے بعد بھی ماننے والے نہیں ہیں۔ وہاں آپؐ کی کیفیت یہ ہے کہ آسمان پر سیڑھی لگا کر یا زمین میں سرنگ لگا کر بھی اگر قبولِ اسلام کے لیے راہ ہموار ہو سکتی ہو تو ہو جائے۔ آسمان پہ سیڑھی لگا کے چڑھنا اور زمین میں سرنگ لگانا، یہ ہمارے ادب کے عام محاورے ہیں کہ اگر ضرورت پڑے تو کسی کام کو کرنے کے لیے انتہائی مشقت اور انتہائی کوشش کرنا، اور آپؐ اس کے لیے بھی تیار رہتے تھے۔

یہ وہ چیز تھی جس کی وجہ سے داعی ہونا آپؐ کی زندگی کا کوئی ایک پہلو نہیں تھا بلکہ آپؐ ہمہ وقت اور ہر دم داعی تھے اور اسی کو آپؐ کے سارے کام میں بنیادی ترجیح حاصل تھی۔ جہاد اسی کے لیے تھا، تلوار اسی کے لیے اٹھائی گئی، خطوط اسی کے لیے لکھے گئے۔ ابتدا سے آخر تک سب سے بڑی فکر جو آپؐ کے اُوپر غالب تھی وہ یہ تھی کہ اللہ کے بندوں تک یہ پیغام پہنچے اور آپؐ سرخ رو ہو کر

اپنے رب کے سامنے حاضر ہوں، اور لوگ گواہی دیں کہ ہاں، آپؐ نے ہم تک پیغام پہنچا دیا، نصیحت کا حق ادا کر دیا، اور جو امانت آپؐ کے سپرد ہوئی تھی وہ ہم تک پہنچ گئی۔ اس لیے آپؐ دن رات اسی کام میں لگے رہتے تھے۔

مدینہ آمد پر آپؐ نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ ایک چھوٹی سی مسجد بنائی۔ اس مسجد کا فرش سنگ ریزوں، ستون کھجور کے درختوں کے اور فرش پر کھجور کی چھال بچھی تھی۔ اس کے بعد ۱۳ برس تک آپؐ نے اس طرف توجہ نہیں کی کہ یہ مسجد پختہ ہو جائے، عالی شان عمارت بن جائے بلکہ آپؐ اسی کام کے اندر لگے رہے کہ خدا کا پیغام دلوں کے اندر راسخ ہو جائے۔ آپؐ کی کوشش تھی کہ ظاہر میں یہ عمارت شان دار ہو یا نہ ہو لیکن دلوں کے اندر دعوتِ حق کی عمارت ضرور شان دار تعمیر ہو جائے۔ یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ آپؐ کے انتقال کے صرف ۱۰۰ برس کے اندر اندر اسپین سے لے کر ہندستان تک انتہائی عالی شان مسجدیں وجود میں آگئیں۔ اگر پہلے ہی دن آپؐ کی توجہ دعوت سے ہٹ کر ان کاموں کے اندر لگ جاتی تو اس کا امکان کم تھا کہ وہ قوت وجود میں آتی جو اس دعوت کے جذبے سے سرشار ہو کر مدینہ سے نکلتی اور دنیا کے گوشے گوشے میں اس پیغام حق کو پہنچاتی۔ مقامِ دعوت کے سلسلے میں یہ آپؐ کا اسوہ اور ترجیح اول تھی جس کو سب سے پہلے سمجھنا ضروری ہے۔

## نبی کریمؐ کے مضامینِ دعوت

دوسری بات جو جاننا ضروری ہے وہ یہ کہ وہ مضامین دعوت کیا تھے جس پر آپؐ شروع سے آخر تک اپنی توجہ مرکوز کیے رہے۔

○ **رب سے تعلق:** آپؐ نے بہت سے کام کیے اور کئی حوالوں سے دعوت دی، آداب کی تعلیم دی، یہ بھی بتایا کہ کیسے کھائیں پئیں اور اٹھیں بیٹھیں، لباس کس طرح پہنیں، لوگوں پر حدود اور سزاؤں کا نظام بھی نافذ کیا، لیکن اس سارے کام کے لیے جو چیز کنجی کی حیثیت رکھتی تھی، وہ یہ ہے کہ آپؐ نے اللہ کے بندوں کا تعلق اپنے رب سے قائم کر دیا۔ یہ تعلق کوئی ظاہری تعلق نہیں تھا بلکہ دلی و قلبی تعلق تھا اور اس کے نتیجے میں ان کو بندگیِ رب کے سانچے کے اندر ڈھال دیا۔

مکی زندگی کے پہلے دن سے لے کر مدنی زندگی کے آخری دن تک آپؐ اس کام سے

غافل نہیں ہوئے کہ اللہ کے بندوں کا تعلق اپنے رب کے ساتھ قائم ہو ـــــ یعنی بندگی کا تعلق، توکّل کا تعلق، خشیت کا تعلق، محبت کا تعلق اور اپنے آپ کو سپرد کردینے کا تعلق۔ اقرأ کے نام سے جو کام شروع ہوا تھا' وہ اپنے رب کی تسبیح، حمد اور استغفار کے حکم تک جاری رہا۔ گویا نبی کریمؐ کے مشن کی تکمیل تک جو کام جاری رہا وہ یہی تھا کہ اللہ کے بندے اللہ کے ساتھ جڑ جائیں۔ جب تک وہ اللہ کے ساتھ نہیں جڑیں گے' ان کے اندر وہ قوت اور طاقت نہیں پیدا ہوگی جو اللہ کی زمین پر اللہ کے دین کو قائم کرنے کے لیے ناگزیر ہے۔

اس دعوت کے اندر وہ کشش تھی کہ لوگ دوڑ کر آتے تھے اور اسی کے ہو کر رہ جاتے تھے۔ اس لیے کہ خالقِ کائنات کی بندگی کے اندر جو لذت' جو نشہ اور جو کشش ہے، وہ کسی اور چیز کے اندر نہیں ہوسکتی۔ اس کی بندگی کی حدود، اس دنیا سے ماورا آخرت تک پھیلی ہوئی ہیں۔ جو اس کا ہو جاتا ہے پھر اس کے لیے دنیا کی کوئی قربانی، قربانی نہیں رہتی۔ جان' مال اور وقت' ہر چیز اس کے لیے حاضر ہوتی ہے۔ اس لیے کہ جس نے اس دعوت کی پکار پہ اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر دیا، گویا اس نے اپنا سب کچھ اللہ کے سپرد کر دیا۔ اگر دنیا کے چھوٹے چھوٹے مقاصد لوگوں کو اپنی طرف کھینچتے رہتے تو ان کی زندگی کے اندر یہ انقلاب کبھی برپا نہ ہوتا اور وہ اس طرح نہ بدلتے۔

بندگی کا یہ تعلق دنیا اور آخرت کے اُوپر محیط تھا۔ زمین و آسمان کی ساری وسعت سے زیادہ وسیع یہ تعلق تھا جو آپؐ نے قائم کیا' اور اس کے نتیجے میں آخرت کا طلب گار بنا کر جنت کا خریدار بنا دیا۔ فی الواقع یہ بہت بڑا انقلاب تھا جو نقطۂ نظر کے اندر، فکر کے اندر، اور دل کے اندر پیدا ہو گیا۔ وہ دنیا میں رہتے ہوئے بھی دنیا کے طلب گار نہیں تھے اور جنت کے خریدار بن چکے تھے۔

○ **جنّت کے خریدار**: اس کا بہترین اظہار اس موقع پر ہوتا ہے جب مدینہ سے بیعت عقبٰی کے لیے ایک بڑا گروہ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور بیعت کی۔ ان میں سے ایک صحابی حضرت عباس بن عبادہؓ کھڑے ہوئے اور انصار کو مخاطب ہو کر کہا: تم کو معلوم ہے کہ تم کس بات پہ بیعت کر رہے ہو؟ اس کے نتیجے میں تمھاری گردنیں ماری جائیں گی، تمھارے اشخاص قتل ہوں گے، تمھاری عورتیں بیوہ ہوں گی اور لونڈیاں بنالی جائیں گی۔ انھوں نے پوری تفصیل کے ساتھ تمام ممکنہ خطرات کو گنوایا۔ اس پر انصار نے کہا: ہاں! ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس کے نتیجے

میں کیا پیش آنے والا ہے۔ نبی کریمؐ نے اس بیعت کو دوبارہ دہرایا۔ جس پر انصار نے یہ سوال کیا کہ ہم کو اس کے بدلے میں کیا ملے گا؟ بعد میں قرآن مجید نے اس پر نَصْرٌ مِّنَ اللّٰہِ وَفَتْحٌ قَرِیْبٌ ط (الصّف ۶۱:۱۳) کا مژدہ بھی سنایا، اور اِنَّا فَتَحْنَا لَکَ فَتْحًا مُّبِیْنًا ○ (الفتح ۴۸:۱) کی بشارت بھی دی، نیز مَغَانِمُ کَثِیْرَۃٌ (النسآء ۴:۹۴)، بڑی کثرت سے مال کا بھی ذکر فرمایا۔ لیکن اس موقع پر جان و مال قربان کر کے سب کچھ دے دینے کے عوض میں حضورؐ نے فرمایا: اس کے بدلے میں تمھیں جنت ملے گی۔ یہ جواب انصار کے لیے کافی تھا۔ اس کے بعد اپنی جان اور مال کے بدلے میں ان کو کسی اور چیز کی ضرورت نہیں تھی۔ اس لیے کہ اللہ کے اُوپر ایمان کے معنی وہ یہ سمجھ چکے تھے کہ سب کچھ اسی جنت کے عوض فروخت کر دینا ہے۔

یہ وہ سیدھی سادھی دعوت تھی کہ جو ایک بدو، ایک تاجر، ایک اَن پڑھ، ایک چرواہے یا کسی عالم اور پڑھے لکھے کے لیے یکساں طور پر پُرکشش دعوت تھی کہ آدمی اپنے خالق کا ہو کر رہے، اس کے ساتھ جڑ جائے، آخرت کا طلب گار ہو اور جنت کی قیمت کے اُوپر اپنے آپ کو راضی کر لے۔

○ **اقامتِ دین کے لیے جدوجہد**: آپؐ کی دعوت کا تیسرا پہلو یہ تھا کہ جنت دنیا کے گوشوں اور خانقاہوں میں بیٹھ کر حاصل نہیں ہو سکتی، بلکہ زمین پر خدا کے دین کو قائم کرنے کی جدوجہد سے حاصل ہوگی۔ اس جنت کی خوشبو حجروں میں نہیں آئے گی بلکہ اس کی خوشبو اُحد کے پہاڑوں کے پیچھے سے آئے گی۔

آپؐ نے جنت کو ایک ایسی حقیقت بنا دیا تھا جس کی انھیں خوشبو بھی آنے لگی تھی۔ مشہور حدیث ہے کہ ایک دفعہ آپؐ نے ہاتھ آگے بڑھایا اور پھر پیچھے ہٹا لیا۔ صحابہ کرامؓ نے پوچھا کہ آپؐ نے ایسا کیوں کیا۔ آپؐ نے فرمایا کہ میرے سامنے جنت تھی۔ اگر میں اس کا خوشہ توڑ کے تم کو دکھا دیتا اور تمھارے درمیان لے آتا تو رہتی دنیا تک کے انسانوں کی غذا کے لیے یہ کافی ہوتا۔

ان کے لیے جنت کوئی افسانہ نہیں تھی جس کو وہ قرآن میں پڑھتے تھے اور گزر جاتے تھے، بلکہ ان کے لیے وہ ایک جیتی جاگتی زندہ حقیقت تھی۔ جب وہ نبی کریمؐ کو اُٹھتے بیٹھتے یا منبر کے اُوپر کھڑا دیکھتے تو سمجھتے تھے کہ سامنے جنت موجود ہے لیکن وہ جنت جہاد کے اندر پوشیدہ تھی۔ بندگیِ رب اور آخرت کی طلب اور جنت کا تعلق جہاد کے ساتھ جوڑ کے انسانی زندگی کے اندر آپؐ

نے اسے راسخ اور مربوط کر دیا تھا۔ اب یہ جنت کے طلب گار وہ نہیں تھے جو گوشوں میں بیٹھ کر صرف درس دیں، بلکہ اس کے نتیجے میں ایک ایسی جماعت تیار ہوئی جو دنیا بھر کو آخرت اور بندگیِ رب کی دعوت دینے کے لیے نکل کھڑی ہوئی۔ لوگوں کے دل فتح ہوگئے، نسلوں کی نسلیں، قوموں کی قومیں اس دعوت کے گرد جمع ہوگئیں۔

خالق و رب کے ساتھ تعلق، آخرت کی طلب اور دنیا کے اندر انسانوں کو ہدایت پہنچانا اور اس کے لیے کوشش اور جدوجہد، یہ دراصل دعوت کا اصل مضمون تھا جس کے لیے کسی لمبے چوڑے فلسفے، منطق اور کتابوں کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ وہ بات تھی کہ ہر آدمی اپنے اندر اس کی پیاس محسوس کرتا تھا۔ وہ بدو، وہ چرواہے اور وہ تاجر جنھوں نے جب اس پیغام کو سنا اور اپنے آپ کو اس دعوت کے حوالے کر دیا تو کسی منطق اور فلسفے کے بغیر ہی وہ دنیا کے امام اور لیڈر بن گئے۔

## نبی کریمؐ کا اسلوبِ دعوت

آپؐ کے اسوۂ دعوت کا چوتھا پہلو یہ ہے کہ آپؐ نے دعوت کے لیے وہ کون سے طریقے اختیار کیے کہ اس دعوت نے قوم کے بڑے حصے کو ایک مختصر مدت میں آپؐ کے گرد جمع کر دیا۔

○ **نجات کی فکر اور خدمتِ انسان**: پہلی بات یہ تھی کہ اس پوری دعوت میں آپؐ کا تعلق انسان سے بحیثیت انسان تھا۔ انسان کو صحیح راہ پہ لانا اور اس کو تباہی اور گمراہی سے بچانا، اور اس عذاب اور اس تکلیف سے جو اس دنیا کے اندر بھی پیش آنے والی ہے اور آخرت میں بھی، اس سے خبردار کرنا جس کے لیے آپؐ نذیر بنا کر بھیجے گئے تھے، جب کہ کامیابی اور نجات پانے والوں کو بشارت و خوش خبری دینا، اس کے لیے آپؐ بشیر تھے اور یہ آپؐ کا فرضِ منصبی تھا۔ لوگوں کے دکھ درد بانٹنا، ان کے کام آنا اور خدمت کرنا اور ان سب پر نمایاں آپؐ کی لگن، سوز اور تڑپ تھی جس نے لوگوں کو آپؐ کی طرف راغب کیا۔ یہ کوئی مجرد بات نہیں تھی جو لوگوں کے سروں کے اُوپر سے گزر جاتی، بلکہ آپؐ اس کو اپنے اسوے کے ذریعے، اپنے کردار کے ذریعے، اپنی خدمت کے ذریعے، انسانوں کی زندگی سے مربوط کرتے تھے۔

نبی کریمؐ انسانیت کے کس قدر ہمدرد، خیرخواہ اور دوسروں کے کام آنے والے تھے، اس کی

ایک گواہی حضرت خدیجہؓ نے دی۔ خدا کا پیغام وصول کر کے جب آپؐ غارِ حرا سے گھبرائے گھبرائے گھر لوٹے اور آتے ہی لیٹ گئے اور کہنے لگے کہ مجھے کپڑا اوڑھا دو، مجھے کپڑا اوڑھا دو، اور فرمایا کہ مجھے اپنی جان کا ڈر ہے۔ حضرت خدیجہ نے آپؐ کو حوصلہ اور تسلی دی اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ آپؐ کو ہرگز ضائع نہیں کرے گا۔ اس لیے کہ آپؐ صلہ رحمی کرتے ہیں، رشتہ داروں اور اقربا کے حقوق ادا کرتے ہیں۔ بات کرتے ہیں تو سچ بولتے ہیں، جو لوگ معاشرے کے اُوپر بوجھ بنے ہوئے ہیں ان کا بوجھ اٹھاتے ہیں، جن کے پاس وسائل نہیں، جو یتیم، بیوہ، غریب، اپاہج اور معذور ہیں، جو کما نہیں سکتے' ان کے لیے کما کر ان کی خدمت کرتے ہیں۔ آپ مہمانوں کا احترام کرتے ہیں اور جو لوگ مشکلات کا شکار ہوں' ان کی مدد کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہرگز آپؐ کو ضائع نہیں کرے گا۔

یہ نبی کریمؐ کے اسوۂ دعوت کی ایک تصویر ہے۔ جو لوگ انسانوں کی تکالیف' مصائب' پریشانیوں اور ان کی خدمت سے غافل ہوں اور یہ چاہیں کہ محض درس وتقریر اور خطاب سے ہی لوگ دین کی طرف دوڑ پڑیں تو وہ یقیناً سخت غلط فہمی کے اندر مبتلا ہیں۔ یہ دعوت اسی وقت عام آدمی کے دلوں کے اندر جگہ پیدا کرے گی جب اس کے داعی انسانوں کے ساتھ اپنے آپ کو اس طرح مربوط کریں کہ ان کے دلوں میں، آخرت میں آگ سے بچنے کی فکر بھی پیدا کریں اور ان کے دنیاوی مصائب وتکالیف کو بھی دور کرنے کی کوشش کریں۔ یہ دونوں چیزیں اس دعوت کے اندر سب سے نمایاں ہیں اور لازم وملزوم بھی۔

○ **اعتماد و بھروسے کا حصول:** دوسری بات یہ تھی کہ آپؐ نے ان کا اعتماد پہلے حاصل کیا اور اس کے بعد پھر اپنی بات پہنچائی۔ جہاں انسان پر اعتماد ہی نہ ہو وہاں پر بڑی خوب صورت اور اچھی سے اچھی بات بھی رائیگاں چلی جاتی ہے۔

آپؐ کے اُوپر لوگوں کا اتنا اعتماد تھا کہ آپؐ پہاڑی پر کھڑے ہو کر پوچھتے ہیں: اگر میں کہوں کہ اس پہاڑ کے پیچھے سے ایک لشکر آ رہا ہے تو تم کیا کہو گے؟ لوگوں نے کہا کہ ہم تمھاری بات پر یقین کریں گے۔ لوگوں کا یہ وہ اعتماد تھا جو آپؐ کو حاصل تھا۔ لوگ یہ سوچ نہیں سکتے تھے کہ یہ آدمی ہمارا بدخواہ بھی ہوسکتا ہے۔ اہلِ مکہ نے آپؐ کی کتنی مخالفت کی' آپؐ کے پیچھے پڑے رہے' آپؐ کے اُوپر کتنا ظلم کیا' آپؐ کا راستہ روکا' کانٹے بچھائے' پتھر مارے لیکن لوگوں کے ذہن میں یہ بات نہیں

آتی تھی کہ خدانخواستہ آپؐ جھوٹے ہیں یا آپؐ ان کے بدخواہ ہیں۔ ابوجہل تک نے کہا کہ یہ میں نہیں کہہ سکتا کہ آپؐ جھوٹے ہیں۔ مجھے تو یہ شکایت ہے کہ آپؐ نے باپ کو بیٹے سے اور بھائی کو بھائی سے الگ کر کے قوم کو پھاڑ دیا ہے۔ اس کے علاوہ آپؐ کے خلاف اور کوئی شکایت نہیں ہے۔ لہٰذا اعتماد ہی وہ اصل ذریعہ ہے جس کے حصول کے بعد ہی اپنی دعوت آگے بڑھائی جاسکتی ہے۔

○ **دعوت کی بنیاد نکتۂ اشتراک:** حضورؐ وہ بات پیش کرتے تھے جس میں مخاطب کے ساتھ نکتۂ اشتراک ہوتا تھا۔ اس لیے کہ کوئی ایسی بات جس کو آدمی بالکل نہ جانتا ہو اس کے دل میں گھس نہیں سکتی۔ یہی نبی کریمؐ کا اور سارے انبیا کا اسوہ تھا۔ وہ بار بار سوال کرتے تھے کہ بتاؤ زمین اور آسمان کو کس نے پیدا کیا؟ یہ ایک نکتۂ اشتراک تھا اور یہاں سے بات آگے چل سکی کہ جس نے پیدا کیا اسی کا حکم بھی چلنا چاہیے اور اسی کی اطاعت ہونی چاہیے۔

اس کی ایک عمدہ مثال عیسائیوں کے وفد سے نبی کریمؐ کا مکالمہ ہے۔ وہ لوگ جس طرح آئے اور مسجد نبویؐ کے اندر ٹھیرے، وہاں ان کو اپنے طریقے کے مطابق عبادت کرنے کی سہولت دی گئی اور ان کی خاطر مدارات ہوئی، اور پھر یہ دعوت پیش کی گئی کہ آؤ اس چیز کی طرف جو ہمارے اور تمھارے درمیان مشترک ہے۔ (اٰل عمرٰن ۳:۶۴)

دعوت حق اگر پیش کی جائے تو بڑی مشکل سے کوئی آدمی ملے گا جو پوری کی پوری دعوت کا مخالف ہو، اور پوری کی پوری دعوت کو رد کرنے کے لیے تیار ہو۔ کوئی نہ کوئی دعوت کا پہلو ایسا ہوگا جو اس کے اور داعی کے درمیان مشترک ہوگا جیسا کہ نبی کریمؐ اور آپؐ کے مخاطبین کے درمیان مشترک تھا۔ دعوت کے اس بنیادی اصول پر بات کو آگے بڑھایا جاسکتا ہے۔

○ **کردار کی زبان:** آخری چیز آپؐ کا کردار ہے۔ قول کی زبان سے بڑھ کر، کردار کی زبان لوگوں کو متاثر کرتی ہے۔

اگر آپ کبھی سیرت میں ان واقعات کا جائزہ لیں جو لوگوں کے قبولِ اسلام اور قبولِ دعوتِ حق کے سلسلے میں بیان ہوئے ہیں تو آپ دیکھیں گے وہ لوگ جنھوں نے قرآن سنا اور ان کے دل کی دنیا بدل گئی، ان کی تعداد انگلیوں پر گنی جاسکتی ہے، جب کہ وہ لوگ جنھوں نے نبی کریمؐ کو قریب سے دیکھا، آپؐ کی نرمی، شفقت اور محبت کا مزا چکھا اور جنھوں نے صرف آپؐ کا چہرہ ہی دیکھا وہ

اس دعوت کے گرویدہ ہوگئے۔ جس طرح لوہا مقناطیس سے چپک جاتا ہے، اسی طرح وہ آکر آپؐ کی ذات سے، آپؐ کی دعوت سے، آپؐ کی جماعت سے چپک گئے اوران کی تعداد کثیر ہے۔

ایک واقعے سے اس کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ راوی بیان کرتے ہیں کہ ہم کچھ لوگ اونٹ لے کر مدینہ پہنچے اور ہمارا خیال تھا کہ ہم اونٹ فروخت کر کے کھجوریں خریدیں گے۔ اتنے میں ایک شخص آیا اور اس نے کہا کہ کیسے آئے ہو؟ ہم نے اپنا مقصد بیان کیا۔ ہم آپؐ کو پہچانتے نہیں تھے کہ کون ہیں۔ انھوں نے کہا: اچھا، میں نے تمھارا اونٹ خرید لیا۔ اس کی جو قیمت طے ہوئی ہے وہ تمھیں مل جائے گی۔ آپؐ نے اونٹ کی نکیل تھامی اور چل دیے۔

جب آپؐ نگاہوں سے اوجھل ہوگئے تو ہم نے سوچا کہ یہ ہم نے کیا کیا۔ نہ ہم اس آدمی کو جانتے ہیں، نہ اس کا نام پتا معلوم ہے کہ کہاں رہتا ہے، اور نہ قیمت ہی وصول کی، اور جو مال بیچا تھا وہ بھی لے گیا ہے۔ پتا نہیں ملے گا یا نہیں؟ ہمارے سردار کی بیوی جو کہ اونٹ کے ہودج میں بیٹھی تھی، اس نے کہا کہ جس آدمی نے اس اونٹ کو خریدا ہے، اس کا چہرہ اتنا روشن تھا کہ یہ کسی جھوٹے آدمی کا چہرہ نہیں ہوسکتا۔ میں اس کی ضمانت دیتی ہوں۔ یہ قیمت تم کو لازماً پہنچ کر رہے گی۔

چند لمحات گزرے تھے کہ ایک آدمی آیا اور پوچھنے لگا کہ کیا تم لوگوں نے اپنا اونٹ فروخت کیا ہے؟ ہم نے کہا: ہاں، ہم نے فروخت کیا ہے۔ اس نے کہا کہ یہ لو وہ قیمت جو تم نے طے کی تھی، اور یہ مزید تمھاری میزبانی اور مہمان داری کے لیے۔ اس طریقے سے یہ معاملہ طے ہوا۔

اسی طرح ایک اور قبیلے سے ایک عورت آئی اور واپس جا کر کہا کہ لوگو! محمدؐ کے پیچھے چلو، اس لیے کہ ایسا سخی آدمی میں نے نہیں دیکھا۔ آپؐ دونوں ہاتھوں سے بھر بھر کر لوگوں کو دیتے ہیں اور ان کی خدمت کرتے ہیں۔

آپؐ کی سخاوت، آپؐ کی شجاعت، آپؐ کی نرمی، یہ وہ چیز تھی جو لوگوں کو اس دعوت کے ساتھ، اس پیغام کے ساتھ چپکائے ہوئے تھی۔ قرآن مجید نے بھی اس بات کو یوں بیان کیا ہے:

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۖ (اٰل عمرٰن ۳:۱۵۹) (اے پیغمبرؐ) یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ تم ان لوگوں کے لیے نرم مزاج واقع ہوئے ہو۔ ورنہ اگر کہیں تم تُند خو اور سنگ دل ہوتے تو

یہ سب تمھارے گرد وپیش سے چھٹ جاتے۔

یہ بات اس بات کے اُوپر گواہ ہے کہ مجرد پیغام کی سچائی کثیر لوگوں کو کسی بھی دعوت کے گرد جمع نہیں کرسکتی۔ جب تک اس دعوت کو پیش کرنے والے اس کردار سے بھی آراستہ نہ ہوں' جو کردار اُن لوگوں کے لیے باعث کشش ہو اور نرمی و محبت کا پیغام لے کر آتا ہو۔

○ **نفرت کے بجاے محبت:** بچوں کو سلام کرنا' پرندوں کو کھانا کھلانا' خود فاقے سے رہ کر مہمانوں کی میزبانی کرنا ایسے بہت سارے واقعات ہیں جو سیرت کے اندر مل سکتے ہیں، اور ان سے جو تصویر کھنچ کر ہمارے سامنے آتی ہے وہ دراصل وہی بات ہے کہ انسان کی خدمت، انسان کے لیے درد، انسان کے لیے سوچ' انسانیت کا احترام اور فلاح و بہبود اور آخرت کی نجات کے تڑپ اور فکر۔ لوگوں کے لیے آسانی پیدا کرنا اور سہولت دینا ہی اصل اسوۂ دعوت ہے۔

آپؐ نے دو صحابہ کرامؓ کو کسی قبیلے میں دعوت کے لیے بھیجا تو کہا: دیکھو' نفرت نہ پیدا کرنا۔ بات اس طرح مت کہنا کہ لوگ اپنے رب سے نفرت کرنے لگیں۔ بات اس طرح کہنا کہ آسانی اور سہولت ہو اور لوگ رغبت کے ساتھ اس کی طرف متوجہ ہوں۔ یہ آپؐ کی رحمت اور شفقت تھی جس نے لوگوں کو آپؐ کے چاروں طرف جمع کر دیا۔

اس دعوت میں مقابلہ' لڑائی' کش مکش اور جدوجہد بھی تھی۔ لیکن کش مکش اور جدوجہد منتقمانہ ذہنیت کے ساتھ یا بدلہ لینے کی ذہنیت اور فکر کے ساتھ نہیں تھی، بلکہ اس پوری جدوجہد میں ہر وقت یہی فکر غالب تھی کہ یہ لوگ نادان ہیں' یہ جانتے نہیں ہیں، جذبات سے مغلوب ہو چکے ہیں اور جاہلیت کے پنجے کے اندر پھنسے ہوئے ہیں۔ یہ اگر آج آکر حق کے مقابلے پر کھڑے ہوئے ہیں' اس کی وجہ باطنی خباثت نہیں بلکہ دھوکے اور فریب کے اندر مبتلا ہونا ہے۔ پھر ان کے لیے دعا گو بھی رہے کہ اے اللہ! انھیں ہدایت دے۔

طائف کے اندر آپؐ کو پتھر بھی مارے گئے' آپؐ کا خون بہایا گیا، اس کے باوجود کہ آپؐ لوگوں سے بدلہ لے سکتے تھے اور ان کو دو پہاڑوں کے درمیاں پیس سکتے تھے، پہاڑوں کا فرشتہ بھی حاضر تھا کہ آپؐ حکم دیں تو اس بستی کو پیس کر رکھ دوں' لیکن آپؐ نے فرمایا: نہیں، میں اس بات سے مایوس نہیں ہوں کہ ان کی نسل میں سے ایسے لوگ اٹھیں جو ہدایت کے راستے پر آئیں۔

غزوۂ اُحد میں آپؐ زخمی ہوگئے، آپؐ کے دندان مبارک شہید ہوگئے۔ اس کے باوجود آپؐ کی زبان مبارک پر یہ الفاظ نہیں تھے کہ لوگو! اُٹھو اور اس کا بدلہ لو' بلکہ یہ الفاظ تھے: رب اھد قومی فانھم لا یعلمون، اے اللہ! میری قوم کو صحیح راستے پر لگا، اس لیے کہ یہ جانتے نہیں ہیں۔ ان کی یہ روش اس وجہ ہے کہ اس سے واقف نہیں ہیں۔

## اسوۂ دعوت: حاصل کلام

اسوۂ دعوت کے ضمن میں یہ چند بنیادی باتیں ہیں۔ اگر ان باتوں کو آج داعیِ حق سمجھ لیں کہ جو کام ہم نے اپنے ذمے لیا ہے اور ہر مسلمان کو اپنے ذمے لینا چاہیے' یہ اس لیے ہے کہ یہ ہمارا بنیادی فرض ہے۔ یہ دراصل 'کارِ رسالتؐ' ہے۔ کوئی اور کام اپنی منزل پر پہنچے یا نہ پہنچے' یہ وہ کام ہے جس کو 'ہر صورت' میں انجام دیا جانا چاہیے۔ یہ بات ہم میں سے ہر ایک کو اپنے سامنے ہمیشہ رکھنی چاہیے کہ میرے گردوپیش جتنے لوگ ہیں ان کو صحیح راستے پر لانے کے لیے میں جواب دہ ہوں۔ پھر مجھے اس پوزیشن میں ہونا چاہیے کہ زندگی کے کسی بھی مرحلے میں، میں ان سے کھڑے ہو کر پوچھوں' خواہ اپنی بیوی بچوں سے پوچھنا پڑے یا اپنے محلے والوں سے' یا کھیتوں میں کام کرنے والوں سے پوچھنا پڑے یا فیکٹری میں کام کرنے والے مزدوروں سے' یا اپنے کاروبار یا ملازمت میں ساتھ کام کرنے والوں سے پوچھنا پڑے کہ کیا میں نے تم تک حق کا پیغام پہنچا دیا ہے، تو لوگ کہیں کہ ہاں، پہنچا دیا ہے۔ ماننا یا نہ ماننا یہ لوگوں کے ہاتھ میں ہے۔ یہ ان کا اپنا فعل اور اپنا امتحان ہے۔ ہم کتنا ہی چاہیں' چاہے اس کے لیے اپنی جان ہی گھلا ڈالیں:

> اِنَّكَ لَا تَهْدِىْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ ۚ (القصص ۲۸:۵۶) اے نبیؐ! تم جسے چاہو اسے ہدایت نہیں دے سکتے، مگر اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔

گویا یہ تمھارے ہاتھ میں نہیں کہ تم صرف اپنے چاہنے اور خواہش سے لوگوں کو صحیح راستے پر لگا سکو۔ لوگوں کا اپنا ارادہ اس کے اندر بنیادی چیز ہے۔ توفیق بھی چاہنے پر ملتی ہے:

> اَللّٰهُ يَجْتَبِىْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِىْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ ۝ (الشوریٰ ۴۲:۱۳)

اللہ جسے چاہتا ہے اپنا کر لیتا ہے، اور اپنی طرف آنے کا راستہ اُسی کو دکھاتا ہے جو اُس کی طرف رجوع کرے۔

دنیا کے اندر نظامِ حق قائم ہو یا نہ ہو، یہ بھی ہماری ذمہ داری نہیں۔ نظامِ حق کے لیے کام کرنا ہم پر فرض ہے لیکن اس کو قائم کر دینا یہ ہماری ذمہ داری نہیں ہے۔ خدا کے بے شمار انبیا تھے جو دنیا سے رخصت ہو گئے، کئی برس کی جدوجہد کے بعد رخصت ہو گئے، مگر ان کی قوموں نے ان کی بات مان کر نہیں دی۔ وہ اپنی آنکھوں سے اس نظام کو قائم ہوتا نہیں دیکھ سکے۔ قرآن مجید نے خود فرمایا:

وَاِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِىْ نَعِدُهُمْ اَوْنَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ ○ (الرعد ۱۳:۴۰) اور اے نبیؐ، جس بُرے انجام کی دھمکی ہم ان لوگوں کو دے رہے ہیں اس کا کوئی حصہ خواہ ہم تمھارے جیتے جی دکھا دیں یا اس کے ظہور میں آنے سے پہلے ہم تمھیں اٹھالیں، بہرحال تمھارا کام صرف پیغام پہنچا دینا ہے اور حساب لینا ہمارا کام ہے۔

گویا حساب لینا اللہ تعالیٰ کی ذمہ داری ہے اور پہنچانا ہماری ذمہ داری ہے۔ پہنچانے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ جس طرح چاہا پہنچا دیا اور فرض ادا ہو گیا، بلکہ اس سے مراد حکمت اور خوب صورتی کے ساتھ، دل کو موہ لینے والے طریقوں اور پورے سوز و درد کے ساتھ پہنچانا ہے۔ یہ وہ بنیادی ذمہ داری ہے جس سے ہم بچ نہیں سکتے، جس کی جواب دہی ہم کو کرنا پڑے گی۔ ہر مسلمان کو یہ جواب دہی عام انسانوں تک دعوت پہنچانے کے حوالے سے کرنا پڑے گی۔ یہ جواب دہی اس حوالے سے بھی ہے کہ جو لوگ اس نعمت، اس ہدایت اور اس ذمہ داری سے واقف نہیں تھے، آیا ہم نے ان کے سامنے اس کو پیش کیا یا نہیں۔

واضح رہے کہ یہ کام کسی دنیاوی اجر یا صلے کی طلب میں نہیں ہو سکتا۔ انبیاے کرام اور خود نبی کریمؐ نے اس بات کو کھول کر بیان کیا ہے:

وَمَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِىَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○ (الشعرآء ۲۶:۱۰۹) میں اس کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں۔ میرا اجر تو رب العالمین کے ذمے ہے۔

میں اپنی بات کو اس حدیث کے اُوپر ختم کروں گا جس میں نبی کریمؐ نے فرمایا ہے کہ قیامت کے روز ایک آدمی بارگاہِ رب میں حاضر ہوگا اور اس سے اللہ تعالیٰ پوچھے گا کہ میں بھوکا تھا، تم نے مجھے کھانا کیوں نہیں دیا؟ وہ کہے گا کہ پروردگار تو سارے جہانوں کا رب ہے تو بھلا کہاں بھوکا ہوتا اور تجھ کو کھانا کیسے دیتا؟ اس پر اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ میرا فلاں بندہ بھوکا تھا اور تو نے اس کو کھانا نہیں دیا۔ اسی طریقے سے وہ اس سے بیمار اور پیاسے کے بارے میں سوال کرے گا۔ احادیث میں مختلف چیزیں مختلف روایات میں بیان ہوئی ہیں۔ لیکن وہ تمام انسانوں کی مادی ضروریات ہیں، یعنی کھانا، پانی، لباس، دوا کہ جن پر اس کی دنیا کی فلاح اور بھلائی کا انحصار ہے۔ اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ جہاں اللہ کے بندوں کی یہ ساری ضروریات پوری کرنے کے بارے میں سوال کیا جائے گا، تو کیا وہاں یہ سوال نہیں ہوگا کہ میرا فلاں بندہ گمراہ ہوکر جہنم کی راہ پر جارہا تھا اور تم نے اس کو کیوں نہیں بچایا؟ یہ سوال اگر کیا جائے گا تو اس سوال کا جواب ہمارے پاس تیار ہونا چاہیے۔

یہ کام وہی لوگ کرسکتے ہیں جن کے بارے میں قرآن نے گواہی دی ہے:

وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا ○ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا ○ (الدھر ۷۶:۸-۹) اللہ کی محبت میں مسکین اور یتیم قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں (اور اُن سے کہتے ہیں کہ)، ہم تمھیں صرف اللہ کی خاطر کھلا رہے ہیں، ہم تم سے نہ کوئی بدلہ چاہتے ہیں نہ شکریہ۔

اگر دعوت پُرخلوص ہو اور اس کے پیچھے یہ روح اور جذبہ کارفرما ہو، اس کی ہر وقت اور ہر دم لگن ہو، اس کے ساتھ اپنے بھائی کے لیے سوز اور تڑپ ہو اور اس کا دکھ درد بانٹنے کی کوشش ہو، اور پھر یہ سب کسی اجر یا صلے کے لیے نہ ہو بلکہ اس لیے ہو کہ اللہ تعالیٰ ہم سے خوش ہو اور ہماری اس کے سامنے حجت قائم ہوجائے۔ اس کیفیت اور جذبے کے ساتھ، اس پیغام کو لے کر اگر آپ ذمہ داری کے ساتھ، اپنے گاؤں، محلے، تحصیل اور ضلع میں کھڑے ہوجائیں تو کوئی وجہ نہیں کہ چند برسوں کے اندر اندر یہ پیغام عام نہ ہو، اور انسانوں کی کثیر آبادی کم سے کم اس سے واقف نہ ہوجائے۔ ماننا یا نہ ماننا اور دلوں کا موڑنا اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ (کیسٹ سے تدوین: امجد عباسی)